پاکستان میں اردو شاعری کی تنقید (رجحانات اور امکانات۔ایک مطالعہ)

روبینہ ناز بخاری، پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر محمد آصف، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ABSTRACT:

The Urdu literature and criticism shared the same ground before partition. But after going through dreadful experience of Pakistan, the political debate made the sensitive minds to urge of reclaiming their individual identities. In this way the terminology of Pakistaniat and Hindustaniat become prevalent in Urdu literature. Therefore the weed was felt to analyze the conspicuous work of trend setter critics and the striking trends and possibilities regarding criticism in Pakistan.

کلیدی الفاظ: جدید اردو نظم، مابعد نوآبادیاتی نظام، تہذیب و ثقافت، لسانی تشکیلات، پاکستانی ناقدین، ادبی نظریات، مباحث، تخیل، تصورات، اشتراک

کسی بڑے متن کو ایک مخصوص خطے /ملک سے منسوب اور مختص کرنا اُس خطے کی مجموعی فضا اور مزاج کو نشان زد کرنے کے مترادف ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو گا کہ ہر متن کا ایک مخصوص مزاج، مذاق اور ماحول ہوتا ہے جس سے وہ نمو پذیر ہو کر اپنی منزل متعین کرتا ہے۔ کچھ یہی صورتِ حال پاکستان میں بھی ہے جہاں اردو شاعری کی تنقید پر بہت سا قابل قدر کام ہوا ہے۔ پاکستان میں اردو شاعری کی تنقید پر بات کرنے سے قبل چند باتیں شعری تنقید کی روایت پر بنیادی مباحث دیکھے جا سکتے ہیں۔

اردو میں ابتدائی تقریظوں، بیاضوں، مکاتیب اور تذکروں سے شعر و شاعری کے تنقیدی شعور کا جنم لینے والی اردو شاعری کی تنقید فن کی نزاکتوں اور جانبداری و غیر جانبداری کے تار و پود سے الجھتی مدح و قدح کا سفر طے کرتی ہوئی جدت تک آپہنچی تب مغربی اثرات کے تحت اس میں تنقید کے واضح خد و خال متشکل ہوئے۔ کلاسیکی عہد میں اردو شاعری کی تنقید کئی مباحثوں کا شکار تھی لیکن بدلتے وقت کے ساتھ موضوعات اور زبان میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انیسویں صدی میں جب مغرب کے سائنسی انقلاب نے حیرت انگیز طور پر دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا کسی خطے کی تہذیب اس سے اپنا دامن نہیں بچا

سکی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے اردو شاعروں کو انگریزی طرزِ فکر اور اسلوبِ حیات کی جانب راغب کیا۔اس کے بعد نئے رواجوں اور نئے افکار کی ردّ و قبولیت نے اردو تنقید کو آگے کی جانب بڑھایا۔ سر سید کی تحریک، شبلی اور امام امداد اثر کی تنقید ہو یا حالی کی تنقید اس میں کئی ترامیم و تنانسخ کی گئیں یوں باقاعدہ تنقید کا سلسلہ شروع ہوا۔اردو تنقید کی باقاعدہ ابتدا نے افلاطون، ارسطو، کولرج، شیلے، ڈرائیڈن اور جانسن سے متاثر ہو کر رومانی عہد دیکھا۔رومانویت کے نظریات کو مشرق و مغرب کی تنقید میں کلیدی حیثیت حاصل رہی۔ رومانویت کے ذریعے جمالیاتی پیرائے کی بنیاد پر امکانات کی تصویر کشی اور انسانی تخیل کو بروئے کار لا کر زندگی کی بقا تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ڈاکٹر محمد حسن نے رومانویت کو زندگی کے اہم ترین پہلوئوں سے ہم آمیز کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ”رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنالیا۔ان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اُداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کہیں خود موت کی آرزو کرتا ہے، کہیں جواں مرگی کو مبارک بتاتا ہے۔وہ اپنی محبوبائوں کو یا تو کسی دیو قامت اساطیری جن کے آہنی قلعوں میں مقید اور منتظر تصور کرتا ہے یا فراق کا گیت گاتے ہوئے دیکھتا ہے۔زندگی درد ہے، انسانی جذبے اور حقیقت کے درمیان ایک مسلسل جنگ ہے اور اس کے زخموں کو وہ پھول سمجھ کر چومتا ہے اور اسی میں زندگی کا کیف اور حسن محسوس کرتا ہے۔“(۱)

اس حقیقت سے انکار تو کیا کرنا اگر اس کا بروقت اعتراف کیا جاتا تو اردو تنقید کا دامن نقالی، چربہ اور اس قسم کی خرابیوں سے بچا ہوا ہوتا؛ آگے چل کر جمالیاتی تنقید کو حقیقت نگاری اور معاشرے میں اخلاقی اصول و ضوابط متعین کرنے والے عناصر سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ترقی پسند تحریک سے رومانوی نظریات کو گزند پہنچا۔ کیونکہ مارکسزم، کمیونزم اور حقیقت پسندی کے غلغلہ نے رومانویت کو پس انداز کر کے عمرانی و مارکسی تنقید کے شعور کو عام کیا۔

اردو شاعری کی تنقید ترقی پسندانہ رویوں کے ساتھ پروان چڑھ چکی تھی جب تقسیم ہندوستان کا واقعہ پیش آیا اس وقت اردو مشرقی و مغربی تنقید کے باہمی ارتباط سے نیا دائرہ عمل تشکیل پذیر ہوا۔ تقسیم سے قبل اردو شعر و ادب اور تنقید کا میدان مشترک تھا لیکن جغرافیائی حدود کے متعین ہوتے ہی ہندوستانیت اور پاکستانیت کی تخصیص وجود میں آگئی۔اردو کا ایک بڑا سرمایہ مشترک ہونے کی وجہ سے اگر ہندوستانی ادب اور تنقید سے چشم پوشی اختیار کی جائے لیکن ہجرت کے اندوہناک تجربے سے گزرنے کے بعد تہذیب و ثقافت میں اشتراک کے باوجود سیاسی اور تاریخی شکست و ریخت نے حساس ذہنوں کو

اپنی الگ شناخت قائم کرنے کی جانب راغب کیا۔ان کے ساتھ ایک طرف قربانیوں سے حاصل شدہ آزادی کا کمزور وجود تھا تو دوسری جانب ہجرت کے نقصانات اور آبادکاری کے مسائل ان سب حالات نے بیسویں صدی کی اردو شعری دنیا کو فکری، موضوعاتی اور ہیئتی حوالوں سے متاثر کیا۔ پاکستان میں اردو شاعری کی تنقید کا یہ دورِ زریں رہا ہے جب تنقید نے بے پناہ چیلنجز کا سامنا ہونے کے باوجود اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ پاکستان کے ابتدائی عہد میں اردو شاعری کی تنقید کے سلسلے میں حلقہ اربابِ ذوق کی کاوشیں ناقابل فراموش ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق نے تنقید کے میدان میں مختلف جہات سے اپنی شناخت بنائی۔انتظار حسین کی رائے کے مطابق:۔

> ''حلقہ کے بانیوں اور معماروں نے ایک عقلمندی کی کہ حلقہ کو جدیدیت یا کسی ایسے ہی تصور کے کھونٹے سے باندھنے کی کوشش نہیں کی اس کے دروازے ہر قسم کے خیال اور ہر رنگ کے ادیب کے لیے کھلے رکھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حلقہ ایک لمبے عرصے تک ذہنی جمود سے بچا رہا۔''(۲)

اس دوران شعری تنقید کے حوالہ سے اہم نام میراجی کا ہے جو اپنے عہد کی سیاسی کشمکش اور مابعد نوآبادیاتی فکر کی بوجھل فضا میں فرد کے فنا ہو جانے کی شکست خوردگی سے دوچار ہونے کے باوجود اس کی بازیافت اور بقا کی تلاش میں تھے۔ وہ بظاہر کئی الجھنوں میں الجھا ہوا شاعر اپنے نظریات اور تصورات میں نہایت سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔انھوں نیمشرق و مغرب کے نغمے لکھ کر اپنی طرز کی تنقید پیش کی۔ان کی تنقید ایک ایسے عہد میں اپنا مقام بنا رہی تھی جب ادبی فضا میں بغاوت اور انقلاب کے نعروں کے بعد تھکاوٹ کا سماں تھا۔ چہار اطراف صرف اس شور کی بازگشت باقی تھی۔یہ فرق کرنا محال تھا کہ یہ کونسا رواج چل پڑا ہے؟ کس کو دوام حاصل ہوگا اور زوال کس نظریے پر منڈلا رہا ہے؟ ایسے میں میراجی کی تخلیقات، تنقیدات اور تحقیقات دھیمے سروں میں بہتا ہوا ایسا جھرنا ہے جو شعری تنقید کو خوش اسلوبی اور متانت کے ذریعے سیراب کرتا نظر آتا ہے۔

میراجی کی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کہتے ہیں:

> ''میراجی کی تنقید میں اس امر کا شدید احساس پایا جاتا ہے کہ جدید نظم کی شعریات نامانوس ہے مگر اُنھیں اس بات پر پختہ یقین تھا کہ جدید نظم ہی معاصر عہد میں فکری، اقتصادی اور ثقافتی

سطحوں پر ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ وہ جدید نظم کو جدید عہد کی روح کا جمالیاتی ترجمان سمجھتے تھے۔"(۳)

اردو غزل کی تہذیبی حیثیت برقرار رکھنے کے ساتھ اردو نظم اور گیت نگاری کے دامن میں جدت و روایت کے حسین امتزاج کی رنگ پاشی کرتا ہے۔ ان کی تنقید کا اسلوب ہندی ذخیرۂ الفاظ کے نفسی مطالعہ اور ہندی تہذیب و ثقافت سے گہری جڑت کا احساس دلاتا ہے۔ میرا جی نے قاری کو فنکار کے حالاتِ زندگی اور نفسیاتی کشمکش سے پھوٹنے والی فن کی معراج سے شناسائی کی طرف راغب کیا۔ وہ زمانی اور تاریخی واقعات کو اہم سمجھتے ہیں اور جیسا کہ فرانز فینن نے قومی دانشوروں کے بارے میں رائے دی ہے کہ:

"یہ فیصلہ کیا کہ وہ زیادہ پیچھے جائیں اور زیادہ گہرائیوں میں اتریں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انہوں نے بے پناہ مسرت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ ماضی میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے شرمسار ہوا جائے۔"(۴)

حلقہ ارباب ذوق میں سجاد باقر رضوی، ظہیر کاشمیری، شہرت بخاری، انجم رومانی، قیوم نظر، آغا بابر جیسے اہم نام شعری تنقید کے حوالے سے یادگار ہیں جنہوں نے اس فورم سے امتزاجی تنقید کو فروغ دیا اور نظم و غزل کی آبیاری کے لیے نئے مضامین جو کہ ماضی کی بازیافتوں سے لے کر مستقبل کے بلیغ اشاروں کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جب بھی امتزاجی تنقید کا ذکر ہوتا ہے تو ہمارے ذہن میں سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام آتا ہے۔ انھوں نے اس تنقیدی فکر کے لیے بہت سا قابل قدر کام کیا ہے۔ بالخصوص اُن کی کتاب امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حقیقت اور فکشن، ساختیات اور سائنس، سوسیور کا نظامِ فکر، رولاں بارت کا فکری نظام، ساخت شکنی، لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں، سٹرکچر اور اینٹی سٹرکچر، مغربی تنقید کے تین اہم اعلانات اور امتزاجی تنقید کے چند جلی اور خفی پہلو جیسے عنوانات قایم کر کے اپنی تنقیدی فکر کو نمایاں تر کیا۔ اس تنقیدی منطقے کے حوالے سے اُن کا کہنا ہے:

"بیسویں صدی میں غیر طبقاتی معاشرے کو وجود میں لانے کی کوشش امتزاجی اکائی کی طرف ایک اہم قدم تھا جو بہ وجوہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن امتزاجی رویے کے اثرات سیاسی، فکری اور انتقادی شعبوں پر ضرور مرتسم ہوئے۔ سیاسی سطح پر بڑی بڑی سلطنتوں کا وہ مخصوص انداز باقی نہ رہا جس میں 'مرکز' کی عسکری قوت نے بھی ایک اہم رول ادا کیا تھا۔"(۵)

پاکستان میں اردو شاعری نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، مخمس، مسدس، مثمن، قطعہ جیسی ہیئتوں سے آگے سفر جاری رکھتے ہوئے اپنی وسعتوں کا دائرہ بڑھایا اور لسانی تشکیلات کے ساتھ نثری نظم تک آن پہنچی۔ تحریک جمود کو توڑنے اور تنوع پیدا کرنے کا عمل ہے جس طرح ایک معاشرتی تحریک معاشرے کے جمود کو توڑ کر ٹھہرے ہوئے پانیوں میں دائرے بناتی ہے۔ اس طرح ادبی تحریک بھی ادب میں تحرک پیدا کرتے ہوئے نئے افکار متعارف کرواتی ہے۔ پاکستان میں نثری نظم کو عام طور پر ایسی باغیانہ روش قرار دیا گیا جس نے ردیف، قافیہ سے آزادی حاصل کر لینے کے ساتھ پابند شاعری کے ذریعے ذہنی اور تخلیقی حد بندیوں کے خلاف بھی ایک رویہ قائم کیا ہے لیکن اس تحریک کے تحت اردو شعر کا عروضی نظام جس کی اکتسابی راہ سے گزرتے ہوئے تخیل اور تصور اپنی اصل کھو دیتا ہے کو چیلنج کیا گیا اور نثری نظم کی تنقید نے شعری آہنگ کی موزونی کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ نثری نظم کے ردّ و قبول کے مباحث میں موافقت و ناموافقت کی بحث سے ہٹ کر ناقدین نے اس کی حمایت کی اور یہ مسلسل پروان چڑھی۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں کہ :۔

> ''جب تک ہم عروض کی بے جا پابندیوں سے اپنے کانوں کو آزاد نہ کرلیں Peech Prethem میں نظمیں کہنا تو بعد کی بات ہے اپنی شاعری کی موجودہ ساکت و جامد آہنگوں کا حجرہ ہفت سے ہی نہ نکل پائیں گے۔ نظم و نثر کا امتیاز عروض کی حدِ فاصل سے نہیں کیا جانا چاہیے۔''(۶)

اس تحریک کے زیرِ اثر تنقید میں سائنسی اور منطقی استدلالیت کو فروغ حاصل ہوا اور لسانیاتی سطح پر نثری نظم کی موزونیت اور تشکیل کے سلسلے میں الفاظ کے زیر و بم اور صور کی سائنس کو برتنے کے حوالے سے لسانیاتی تنقید کے شعور کا ظہور ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کا خیال ہے کہ :

> ''لسانی تشکیلات کے علم برداروں کے پیش نظر بڑا مقصد نئی شاعری کے مسائل، ضرورت اور اس کا جواز تھا۔ جس کے لیے انھوں نے روایت سے مکمل انحراف کو ضروری سمجھا۔ اس مقصد کے لیے قدیم شعرا کے ساتھ ساتھ اپنے پیشرو شاعروں مثلاً میراجی، راشد، قاسمی، قیوم نظر وغیرہ کے شعری اسلوب کو بھی ردّ کر دیا۔ انھوں نے نئی شاعری میں ابلاغ کے لیے بنیادی اہمیت زبان کو دی۔''(۷)

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی مذکورہ بالا رائے سے اس لیے بھی اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ لسانی تشکیلات کے علمبرداروں نے قدیم اور جدید شعرا کے متون کو یکسر استرداد کیا۔ کیوں کہ ان کے اس تناظر میں نئی شاعری کے تال میل کو ہم آمیز کرنا مقصود تھا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو شہزاد احمد کا یہ سوال بر محل بھی ہے اور موزوں بھی:

> ''آخر شعرا کے لیے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ الفاظ کو کم و بیش اسی مفہوم میں استعمال کریں جس میں وہ کلاسیکی ادب یا عام بول چال میں مستعمل ہیں۔ مفہوم کی پروا کیے بغیر الفاظ کے نئے رشتے کیوں نہ دریافت کیے جائیں؟''(۸)

پاکستان میں اردو شاعری کی تنقید میں نثری نظم کی تنقید نے خاصا مقام حاصل کیا اور نئے لسانی ڈھانچوں کے مباحث سامنے آئے۔ اردو زبان نے دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی آمیزش سے بدلتے وقت کے ساتھ نئی معنویت کی تعمیر و تشکیل کی۔ متن کے ڈکشن اور مفاہیم کے مختلف رویوں کو پیش کرنے میں افتخار جالب کی تنقید نے ادبی نظریاتی قوتوں بالخصوص ترقی پسند تحریک پر بھاری ضرب لگائی۔ ان کی شعری تنقید میں شعر کی لفظیات کے ڈھانچوں میں شاعر کی قوت تخیل اور فکری گہرائی کی سطح کو منعکس کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ افتخار جالب کی تنقید کی شعری تنقید لسانیاتی، معنیاتی اور نفسیاتی حوالوں سے نہ صرف منفرد اور مختلف ہے بلکہ ٹکے بندھے رویوں کے خلاف کئی اشاروں کا سامان رکھتی ہے۔ بالخصوص جب وہ فنکار کی اوریجنلٹی کے قائل ہوتے ہیں ان کے مطابق زندہ آدمی کو نئی وارداتوں کا مرتکب ہونا چاہیے۔

> ''آپ نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ مربوط نظم سے لطف اندوز ہونے کے لیے سلسلۂ ربط دریافت کرنے کی زحمت کون کرے؟ آپ کے لیے ریزۂ خیال ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ ذرا یہ دیکھیں کہ جذبۂ بے اختیار کی شکل کو گرفت میں لینا، من و عن گرفت میں لینا، کتنے جوکھم کا کام ہے؟ آپ لے دے کے مانوس جذبوں کے میدان کے کھلاڑی ہیں۔ کبھی کبھی جذبۂ بے اختیار کی نامانوس شکلوں کی بے شکلی پر بھی توجہ کر لیا کریں۔ آخر زندہ آدمی یک سرا ہونے پر اتنا اصرار کیوں کرے۔''(۹)

لسانی تشکیلات کے حوالہ سے انیس ناگی، جیلانی کامران، افتخار جالب اور مزید آگے چل کر سعادت سعید نے نئی شاعری کے جواز پیش کیے اور شعری تصورات کے نئے زاویے متعارف کروائے۔ حلقہ ارباب ذوق اور لسانی تشکیلات کی تحریک جدیدیت کے زیر اثر تھے۔

نئی شاعری اور لسانی تشکیلات کے حوالے سے افتخار جالب کا نام ایک بانی شاعر اور نقاد کے طور پر بنیادی اہمیت کا حامل ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر میں کیا ہے۔ انھوں نے نئی نظم کے عنوان سے مضامین کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا جس میں اُس عہد کے اہم ترین ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ مثال کے طور پر صفدر میر، اختر احسن، گوہر نوشاہی، عزیز الدین احمد، تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ظہیر کاشمیری، جیلانی کامران اور انیس ناگی کے مضامین شامل تھے۔

پاکستان کی شعری تنقید کی تاریخ میں انیس ناگی کا شمار چند اہم ترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ادب کی متعدد اصناف میں اپنے علم کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے بہ یک وقت شاعری، افسانہ، ناول، تنقید اور تراجم میں طبع آزمائی کی اور بہت قابل قدر ادبی سرمایہ اردو دنیا کو مہیا کیا۔ وہ لسانی تشکیلات کے ایک اہم ترین نقطۂ نظر اور داعی کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ساٹھ کی دہائی میں نئی شاعری کی تحریک کے نام سے سامنے آنے والے ان لوگوں میں شامل تھے جن کے لیے رائج شاعری کا روایتی پیرایہ اور اظہار ناقابل قبول تھا اور وہ شاعری میں نئے اظہار کو رواج دینا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں اُن کے تصوراتِ شعر وادب کی بازگشت اُن کی تنقیدی کتب اور مضامین کی صورت میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر: تنقیدِ شعر، شعری لسانیات، نثری نظمیں، نیا شعری افق، تشکیلات، میراجی: ایک بھٹکا ہوا شاعر، غالب: ایک شاعر، ایک اداکار اور تصورات وغیرہ۔

پاکستان میں لسانی تشکیلات اور نئی شاعری کی تفہیم کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید کا نام بھی ایک اہم ترین حوالہ ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک نظریے اور فکر سے وابستہ نقاد ہیں۔ انھوں نے شاعری، تنقید اور تراجم بھی اپنی تخلیقی انفرادیت کو برقرار رکھا اور انھوں نے نئی شاعری کے لسانی تشکیلات کے ضمن میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں جس کی عملی صورت گری اُن کی کتابوں جدید اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک، فن اور خالق: چند جدید نظم گو شعرا کے مطالعے، جہت نمائی، ادب اور نفی ادب اور ن م راشد اور ثقافتی مغائرت میں دکھائی دیتی ہے۔

ہماری ماضی قریب کی اردو تنقید میں سلیم احمد کا نام نئے پن کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اُن کا نام اردو نظم کی تنقید میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ اس کی ایک وجہ اُن کے تنقیدی موضوعات کا اچھوتا پن تھا۔ مثال کے طور پر اُن کی دو کتابوں کے نام کچھ یوں تھے: نئی نظم اور پورا آدمی اور نئی شاعری نامقبول شاعری! اوّل الذکر کتاب میں انھوں نے نئی نظم کے لیے

پورے آدمی کی اصطلاح وضع کی اور اس تناظر میں مختلف شعرا کے کلام کا جائزہ لیا اور انھیں پورے آدمی کی بجائے آدھے آدمی کی شاعری کہا۔ مثال کے طور پر فیض کے حوالے سے اُن کا کہنا ہے:

> "(فیض کے) مجموعے پر مجموعے دیکھتے چلے جایئے ہر جگہ یہی جانے جانے کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ وداع، گریز، سفر، مسافر، غمِ دوراں، غمِ دنیا، غمِ انسان۔ میرا سوال اب بھی وہی ہے۔ پیارے شادی کرو گے یا نہیں؟ شادی کرنی ہے تو محبوبہ کیا بری چیز ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ یہ رومانی محبت ہے۔ اس کی شریعت میں شادی حرام ہے۔ کیوں کہ شادی اپنی فطرت میں کو، جنسی زندگی کو، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا نام ہے کہ ہم آدمی ہیں۔" (۱۰)

ایک طرف جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی دوڑ تھی تو دوسری جانب کلچر کے مسائل، پاکستان کو ماضی کی بازیافتوں کے لیے برصغیر کے قدیم علمی خزانے سے رجوع کرنا لازم تھا لیکن مذہبی تصورات پر قائم ہوئی تقسیم نے اپنے طرزِ عمل میں پاکستان کے اندر عرب کی سرپرستی کو قبول کیا نئے انسان اور نئی صدی کے ذہن نے اپنے لیے نئی راہوں کی تجویز سوچی۔ اردو شاعری کی تنقید میں تہذیبی، تاریخی، ثقافتی، لسانیاتی حوالوں سے جدید نظریات کی دریافت اور قدیم کی بازیافت سے کوائف شعر کی ہیئتوں اور اظہار کو موثر وسیلوں کا سامنا رہا۔ یوں اردو تنقید نے اپنا دامن وقت کے ساتھ ترقی اور توسیع کی جانب بڑھائے رکھا مگر پاکستان کا ماحول ساختیاتی مطالعہ کے لیے کبھی سازگار نہیں رہا لہٰذا کلچر کو جدت سے جوڑنے میں ایک دراڑ سی پڑی معلوم ہوتی ہے۔ اردو زبان کا اصل ماخذ سنسکرت اور برصغیر کی دھرتی پر صدیوں سے آباد قوموں کی ہندی بھاشاؤں کا لب ولہجہ تھا لیکن اردو کا ناطہ عربی و فارسی سے جوڑ کر محدود کرنے سے اس میں ایسا رخنہ پڑ گیا جس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ نفسیاتی تنقید کے ساتھ اہم رویہ اساطیری تنقید کا تھا جس میں کسی عہد کی تاریخی تبدیلیوں کی اہمیت کو اجاگر کیا جانا ممکن ہو سکتا تھا۔ اساطیری تنقید آفاقی ادب اور اس کے اثرات کا تعین کرتی ہے۔ نفسیاتی تنقید ہو یا اساطیری یہ رومانویت کے پیش پیش چلتی ہیں لیکن ہمارے ہاں ابتدا ہی سے یک رخے پن کی بنیاد پڑ چکی تھی جیسا کہ مارکسی اور حقیقت پسندانہ تنقیدی رویے نے رومانویت کو یکسر رد کرنے کے لیے اس کی تہذیبی و ثقافتی ہی نہیں نفسیاتی اور اساطیری حیثیت کو بھی محض تخیلاتی، ماورائی اور قدامت پسندانہ رویہ کہہ کر رد کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔

پاکستان میں اردو شاعری کی تنقید میں ایک تریں نام ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے جنھوں نے اپنے تنقیدی تصورات سے تنقیدِ شعر کی آبیاری کی اور اردو شاعری کی تنقید کو ثروت مند کیا۔ اس ضمن میں اُن کی کتابیں اردو شاعری کا مزاج، نظمِ جدید

کی کروٹیں، مجید امجد کی داستانِ محبت اور متعدد مضامین ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے غزل، نظم، گیت وغیرہ کے اسرار کو اپنے قارئین کے لیے ابلاغ کیا۔ وہ شعری کیفیت کو انکشافِ ذات کے تابع قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے وہ باقاعدہ جواز بھی پیش کرتے ہیں:

> ''جب ہم نظم کو بنیادی طور پر ایک صنفِ شعر قرار دیتے ہیں تو قدرتی طور پر اس شعر کے بنیادی محاسن کے بھی متوقع ہوتے ہیں اور یہ بات فرض کر لیتے ہیں کہ نظم صرف اس وقت نظم کہلانے کی مستحق ہے جب اس میں کوئی شعری کیفیت بیان ہوتی ہے پھر چونکہ شعری کیفیت انکشافِ ذات کے عمل کے تابع ہے۔ نیز چونکہ اپنی مجرد حیثیت میں یہی کیفیت محض احساس اور تخیل کا بے محابا اظہار ہے اس لیے جب نظم اپنے منبع سے دور ہٹ جاتی ہے اور انکشافِ ذات کے عمل کی بجائے خارجی موضوعات کے بیان تک خود کو محدود کر لیتی ہے تو اسی فاصلے کی نسبت سے اس میں شعری کیفیات بھی رقیق ہو جاتی ہیں۔''(۱۱)

پاکستان میں شعری تنقید کا ایک اور معتبر نام ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا ہے جنھوں نے جدید شاعری کی مختلف جہات پر یکسر مختلف زاویہ ہائے نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کتابیں مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات، اُس کو اِک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں: میرا جی کی نظم و نثر کے مطالعات اور نظم کیسے پڑھیں حوالہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ اُن کے متعدد دیگر مضامین پاکستان میں شعری تنقید کی روایت کو مستحکم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور حقیقی طور پر معرکہ آرا ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر: جدید اردو نظم کا تانیثی تناظر، فیض اور مارکسی جمالیات، صارفی معاشرت کے تناظر میں راشد کی شاعری کی معنویت، مقدمۂ شعریاتِ فیض، نثری نظم: ایک نوٹ جیسے اہم ترین مضامین نے بہر حال ایک ارتعاش پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے متعدد اصناف میں کام کیا ہے۔ ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک معتبر تاریخ نویس ہیں۔ انھوں نے ادبی تاریخ نویسی میں اردو ادب کی تاریخ کے عنوان سے ایک اہم ترین ادبی تاریخ تاریخ پیش کی ہے۔ راشد شناسی میں ایک معتبر حوالہ لا=راشد بھی ہے۔

ڈاکٹر فخر الحق نوری نے جدید شاعری کی تنقید کے حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے۔ بالخصوص نثری نظم کی تفہیم کے حوالے سے اُن کی کتاب نثری نظم ایک اہم حوالہ ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا اہم ترین کام ن م راشد پر ڈاکٹریٹ بھی ہے۔

راشد شناسی پر انھوں نے متعدد قابل قدر کام کیے ہیں۔ مثال کے طور پر: مطالعۂ راشد اور ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم وغیرہ۔

ڈاکٹر سید عامر سہیل کی بنیادی شناخت مجید امجد کے ایک اہم نقاد کی ہے جس پر انھوں نے ڈاکٹریٹ بھی کیا ہے۔ اُن کی کتابیں مجید امجد نقش گرِ ناتمام اور بیاضِ آرزو بکف مجید امجد شناسی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی قرأت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک سچے محقق اور تحقیقی لگن کے جویا نقاد ہیں۔ انگارے کے نام سے ایک ادبی جریدہ بھی نکالتے ہیں۔ جس کا حال ہی میں سنچری نمبر منظر عام پر آیا ہے۔ ان شماروں میں جدید نظم کو سمجھنے کے لیے خاطر خواہ مواد بآسانی مل سکتا ہے۔ مجید امجد شناسی میں ایک اور اہم حوالہ ڈاکٹر نوازش علی کی کتاب مجید امجد شخصیت اور فن بھی ہے۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی خود بھی بہت اچھے شاعر اور نقاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی جدید نظم پر بھی گہری نظر ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کتابیں جدید نظم کی تیسری جہت اور اردو نظم اور معاصر انسان جدید نظم کی تفہیم کے حوالے سے نئے موضوعات کی حامل ہیں۔

صنعتی کلچر اور اقتصادی تبدیلیوں نے مادی ضرورت کے نظام کے تحت نئے اقدار وضع کیے جنھیں اردو شاعری کی تنقید میں بھی جگہ ملی اور بین الاقوامی رویے کے ساتھ چلنے کے سلسلے میں وہ تمام لوازمات میسر لانے کی کوشش کی گئی جس سے ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں سے انسان کے لیے شعر کے ذریعے سے ایسی تصویر پیش کی جاسکے جو اس کی تہذیبی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی ہی نہیں بلکہ معاشی سطح کو بھی بہتر کرنے کے لیے اس کی ذہنی و جذباتی کیفیتوں کی تربیت میں معاون ثابت ہو سکے۔

پاکستان میں جدیدیت کے تمام رویوں نے متن کے لامتناہی زاویوں سے مصنف، قاری اور نقاد کے تعلقات سمیت تشکیلیت، ردِ تشکیلیت سے لے کر مابعد جدیدیت کے دور تک سفر کیا۔ ساختیاتی تنقید معنی کی تہ در تہ جہتوں سے نئے افکار تلاش کرنے کی دعوت پیش کرتی ہے اور ہر اس بندش سے منہ پھیر لیتی ہے جو کسی متن کو ایک دائرے کا پابند ٹھہرائے۔ لسانیاتی تنقید سائنٹفک اصولوں کے تحت اس پر رکتی ہے۔ اردو تنقید میں جمالیاتی تنقید تعصب کا شکار رہی شاید اس لیے کہ اس سے کوئی خوف مانع رہا۔

اہم مباحثِ تنقید، تکثیریت، ردِ تشکیل، کالونیل ازم، پوسٹ کالونیل ازم اپنی شناخت کے لیے حوالہ چاہتے ہیں۔ تاریخ جب ترقی اور تبدیلی کا چولا بدلتی ہے؛ یہ لازمی ٹھہرتا ہے کہ اپنی بنیادوں سے وابستہ رہنے کے آثار برقرار رکھنے کی

کوشش کی جائے۔ رواں عہد کی تیز تر لہر مابعد جدیدیت ہے جسے پریشان خیالی سے موسوم کیا گیا۔ ایسے میں جدید ادب جس کے بارے میں ناصر عباس نیرّ کی رائے ہے کہ:

> ''جدید ادب کا مطالعہ ایک آرٹ اور ایک تکنیک ہے۔ جدید نظم خود ایک آرٹ ہے مگر اس کا آرٹ ہونا مشروط ہے۔ قاری کی شرکت سے، اور ایسی شرکت جو بہ یک وقت جذباتی اور علمیاتی ہو۔ جدید نظم اس وقت اُس وقت تک نہیں کھلتی، جب تک اس کی علمیات یعنی اس کے فلسفۂ آرٹ کا علم نہ ہو۔''(۱۲)

حالاں کہ اس رویے نے تعصبات اور سخت رویوں کی منسوخی کا اعلان کیا ہے لیکن تیزی سے ہوتی ہوئی سائنسی ترقی کے ساتھ گلوبلائزیشن جیسی اصطلاح نے محدود پیمانوں کو ایک جست میں عبور کر لیا ہے۔ دنیا میں مابعد جدیدیت کے بعد مابعد تھیوری کے مباحث پیش کیے جا رہے ہیں جس کے تحت شعر و ادب اور تنقید کے نئے امکانات وضع کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں قدم قدم پر نظریاتی بندشوں کا سامنا رہتا ہے۔ ذہنی ترقی اور شعور کی بالیدگی کو مکمل آزادی درکار ہوتی ہے لیکن اردو میں اس خلا کو پُر کرنا ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ ایٹم کی پاور اور انٹرنیٹ کی ترقی کے ساتھ جدید سہولیات اور آمد و رفت کے تحت کسی علاقہ یا خطہ کی مخصوص حد نہیں رہی۔ فکری سطح پر کوئی حد بندی ممکن نہیں۔ یہ رویہ اپنی کشادگی اور بے کراں وسعتوں میں نئے سے نئے رجحانات اور امکانات کا داعی ہے۔ لہٰذا اب یہ ممکن نہیں رہا کہ پرانی روش کے تحت جدید رویوں سے چشم پوشی اختیار کی جائے یا ان سے مخاصمت برتی جائے۔ جدت کے ساتھ چلنے میں پس و پیش کرنے والوں کے پاس آئندہ زمانوں میں تقلیدی روش کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اس وقت ساری دنیا تاریخی طور پر نئی دنیا میں داخل ہو چکی ہے۔ اکیسویں صدی کی نئی ایجادات اور نئے رویوں تک ایک ٹچ کے ساتھ رسائی ممکن ہے۔ گوگل ٹرانسلیٹر اور آئے روز نئی ایپس کے تعارف نے نہ صرف زبان کی بندشوں کو ختم کیا ہے بلکہ ذرائع اظہار کے لیے سرحدیں کھولی ہیں۔

صارفیت کے دور اور منڈی کی یلغار نے کمرشل دنیا کے نئے تقاضوں کے تحت سیاسی قدریں بھی بدل دی ہیں اور معاشرتی نظام بھی علم، تجارت، سیاست، مذہب غرض تمام سماجی ڈھانچہ گلوبلائزیشن کے حصار میں ہے۔ ایسے میں نئے نظریات ایسے معجزوں کی دعوت پیش کر رہے ہیں جن میں کشادگی، وسعت اور آزادی کے ساتھ وہ ترجیحات شامل ہوں جن میں انسان دوستی اور انسانیت کی مثالوں کو فروغ مل سکے اور شعر و ادب میں ایسی عمدہ کارکردگی پیش کرتا ہو جو سرحدی حد بندیوں سے ماورا ہو۔ ایک طرف اس منظر نامہ پر آزادی کا خوبصورت کارواں ہے تو دوسری جانب شورش اور برق رفتاری

میں فرد کی تنہائی نے لایعنیت اور غیر یقینی کی کیفیت کو جنم دیا ہے۔ ایٹم کی طاقت، جنگ اور بدامنی کا خوف انسان کی حساس فکر سے دامن گیر ہے۔ عالمگیریت کا عمل کمپیوٹر نیٹ ورک، انٹرنیٹ، مواصلاتی نظام، بین الاقوامی مالیاتی اداروں، ایسوسی ایشنز اور عالمی تجارتی اداروں کے ذریعے غیر محسوس طریقے پر وقوع پذیر ہے۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں کس طرح پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہیں، اس بارے میں سید عظیم کا کہنا ہے:

> ''ان میں زیادہ تر کمپنیوں نے دوسری کمپنیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اور غریب ملکوں کی سستی محنت اور خام مال کے لیے دوسرے ملکوں میں پلانٹ لگائے۔ کئی کمپنیاں درآمد پر عائد ٹیرف ڈیوٹی بچانے کے لیے پلانٹ لے گئیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا معاشی کردار اپنے اور دیگر ملکوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مثلاً امریکہ میں چند لیبر گروپس یہ سمجھتے ہیں کہ امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں دوسرے ملکوں میں معاشی سرگرمیاں کر کے اپنے ملک میں بیروزگاری بڑھا رہی ہیں۔ دوسرے لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اِن کمپنیوں نے دوسرے ملکوں سے مقابلہ کر کے امریکیوں کے لیے زیادہ نوکریاں پیدا کی ہیں۔''(۱۳)

پاکستان میں مابعد جدیدیت کے نظریات کو شعری سطح پر ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، اقبال آفاقی، فہیم اعظمی اور ضمیر علی بدایونی نے پیش کرنے کا آغاز کیا تھا۔ کلچر کی مذہبی و ثقافتی کشاکش میں ساختیاتی مطالعات کی ساکھ برقرار رکھنے اور جدید نظریات پیش کرنے میں ناصر عباس نیر، سعادت سعید، صلاح الدین درویش، اور نگ زیب نیازی اور قاسم یعقوب ایسے ناقدین ہیں جن کی تنقید تخلیقیت کے ساتھ نئے رویوں کو اختیار کر رہی ہے اور پاکستان میں اردو شعر کے حوالہ سے سائنسی دریافتوں اور مصنوعات کے انقلابات میں شعریت کی ساکھ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پاکستان میں اردو شاعری بالخصوص اردو نظم کی تانیثی جہت کو نمایاں کرنے میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، عذرا عباس، سارا شگفتہ، ادا جعفری کے نام اہم ترین ہیں۔ مذکورہ بالا شاعرات نے اپنی تحریروں میں نسائی شعور کی تفہیم کے وسیلے سے روحِ عصر کا مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں نسائی تنقید اور نسائی ادب کے مطالعے کا ایک عمومی حصّہ تھا جس کی ہلکی سی جھلک چند ناقدین کے تجزیوں میں نظر آتی تھی مگر اب نسائی شعور کا مطالعہ ایک فکری دبستان کے پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ شاہدہ حسن نے نسائی شعور اور ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''اگرچہ یہ سوال بھی بار بار اٹھایا جاچکا ہے کہ نسائی ادب کی تخصیص کی ضرورت ہی کیا ہے اور کہیں یہ ایک فرقہ وارانہ رویے کے مترادف تو نہیں؟ مگر پھر مختلف لکھنے والوں نے وقتاً فوقتاً ان تمام عناصر کی وضاحت کی ہے جو کسی عورت کی تحریر کو مرد کی تحریر سے مختلف بنادیتے ہیں۔ اردو داں طبقے میں چوں کہ اس قسم کے مباحث عام نہیں رہے ہیں اس لیے نسائی شعور کو سمجھنے کی راہ ابھی ہموار نظر نہیں آتی۔''(۱۴)

خواتین ناقدین میں ڈاکٹر شاہین مفتی کا نام اس حوالے سے بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے جدید اردو نظم میں وجودیت کے عنوان سے اپنا تنقیدی وژن اردو دنیا میں پیش کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے وجودیت کے مفاہیم، وجودیت کے علمبردار اور وجودیت کی اصطلاحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال، ن م راشد، میرا جی، فیض احمد فیض، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، وزیر آغا، انیس ناگی اور کشور ناہید جیسے جدید اردو نظم کے تخلیقی ذہنوں کو تنقیدی نقطہ نظر سے جانچا اور ان کے کلام میں پائے جانے والے وجودی نظریات کی بڑی عمدگی سے تعبیر کی۔ اقبال کے کلام میں پائی جانے والی وجودیت کے تار و پود کو انھوں نے اس انداز میں کھولا ہے:

> ''دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے وجود میں موت کی دہشت کس حد تک راسخ ہے اور وہ انفرادی موت کے ساتھ ساتھ اجتماعی موت کا کیا تصور رکھتے ہیں۔ وہ موت کی تذکرہ نویسی میں مشغول ہیں یا خود خواہشِ مرگ کے رسیا ہیں۔''(۱۵)

حالیہ وبا نے دنیا کو معاشی اور نفسیاتی حوالوں سے متاثر کیا ہے۔ اس کے منفی اثرات کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ زمین جس پر انسان نے ماحول دشمنی اور اخلاقی دائرے سے نکل جانے کی حالت میں خود مرکزیت کو شعار بنالیا ہے۔ وبا نے انسان کو خوف، بے بسی اور غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ انسان کو انسان کی ضرورت اور اپنی بے بسی کا احساس ہوا ہے۔ کورونا وائرس نے بلا تخصیص سرحد، رنگ، زبان اور نسل انسانی زندگی پر حملہ کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں اردو شاعری اور اس کے ناقدین کے پاس مابعد تھیوری اور اس کے وسیع امکانات میں استناد کے اصول کیا ہوں گے؟ ہر آن بدلتی دنیا میں ان کا کردار کیا ہوگا؟ تخلیق کی نئی صورتوں اور تخلیق کار کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے کون سے پیرامیٹرز وضع کیے جائیں گے؟ روزانہ کی بنیاد پر گلوبل ویلج میں متعارف ہونے والے نظریات میں ناقد کا کردار کیا ہوگا؟ ان نظریات کی عمر کتنی ہوگی؟ اور اس کی پختگی کے لیے کیا جواز ہوں گے؟ فورجی انٹرنیٹ اور فائیو جی کی پیش رفت میں جہاں انسان کی

زندگی مزید سہل ہو جانے کی جانب رواں ہے وہاں فکری اور تخلیقی سطح بھی تقاضا کر رہی ہے کہ سائنسی طرزِ فکر کو اختیار کیا جائے اور روز کی تبدیلیوں اور معیشت کی منڈی میں اقتصادیات کی ضروریات کے پیشِ نظر فیشن مارکیٹ کے رجحانات فکری طرز پر نہیں بلکہ اکانومی کی بنیادوں پر استوار ہو رہے ہیں۔ مائیکرو دوڑ میں شرابور انسان کو مزید سے مزید سہولت درکار ہے۔ ایسے میں اگر شعر و ادب یہ سہولت مہیا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے پاس اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کیا جواز موجود ہے؟ کیونکہ بدلتے افکار اور نظریات کی ترجیحات و توضیحات میں سب کچھ خودکار (آٹومیٹک) ہو چکا ہے۔ وہ تنقیدی پیمانے جو حسن و قبح کی پرکھ میں اہم تھے۔ ان کی حیثیت پر سوال اٹھ چکے ہیں۔ تیز رفتاری اور بے ہنگم شور میں شعر کی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے عین ممکن ہے کہ ہمیں جمالیات اور رومانویت کی جانب مڑ کر جانا پڑے کیونکہ مابعد تھیوری بتا رہی ہے کہ جدید انسان نے ذہنی تسکین کے لیے اپنے جسم اور جنس کو مرکز بنالیا ہے۔ ٹیری ایگلٹن نے لکھا ہے کہ:

> "جنسی وصال کرتے جسموں پر تو بہت توجہ دی جاتی ہے لیکن مشقت کرتے جسموں پر نہیں۔ مڈل کلاسیے طالب علم لائبریوں میں ویمپائرزم، سائبورگ اور فحش فلموں جیسے سنسنی خیز موضوعات پر کام کرتے ہوئے بڑی جاں فشانی سے ٹولیاں بناتے ہیں۔"(۱۶)

پاکستان میں جنسی آزادی مفقود ہے۔ آئے روز ریپ کیسسز اور جنسی فرسٹریشن کے نتیجے میں بڑھتے ہوئے جرائم اور بے راہ روی کی فضا میں رومانیت کا پرچار کرنے اور موسیقی و ردھم کے تفریحی عناصر کے ساتھ انسانی ذہن کی تربیت و آسودگی کے لیے شعر کو انسانی شعور تک رومانویت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا کی رنگارنگی اور تنوعات کے ساتھ اس بھیڑ میں شامل ہونا پڑے گا۔ یہ فیصلہ وقت کر چکا ہے کہ سنجیدہ خیالات کی اشاعت اور سماجیات کی بہتری کے لیے براہِ راست جدید نظام کا حصہ بننا پڑے گا جہاں نظریات و خیالات کو اچک کر ان کا حال حلیہ بگاڑ کر پھیلانے کی پوری ایک مارکیٹ موجود ہو وہاں نظریات و افکار کی بقا اور اشاعت کے لیے ناقدین پر ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نمایاں مباحث میں ساختیاتی تنقید، قاری اساس تنقید، پسِ ساختیاتی تنقید، تانیثیتی تنقید، مابعد نوآبادیاتی تنقید، نوتاریخیت شامل ہیں جن میں پاکستانی ناقدین اپنا حصہ شامل رکھنے میں کوشاں ہیں۔

پاکستان میں متذکرہ بالا موضوعات کے علاوہ جدید اردو نظم کی تفہیم کے حوالے سے بھی بہت سا قابلِ قدر کام مسلسل ہوا ہے۔ اس ضمن میں تنقیدی کتب کے علاوہ مختلف رسائل نے بھی بھرپور کردار ادا کیا ہے اور بہت سے موقر اور

معتبر رسائل نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا ہے۔ مثال کے طور پر نگار کا جدید شاعری نمبر، ادبیات کا نثری نظم نمبر، اوراق کا نظم نمبر اور نقاط کا نظم نمبر قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک (ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۱

۲۔ انتظار حسین، حلقہ اربابِ ذوق۔ تنظیم، تحریک، نظریہ، ڈاکٹر یونس جاوید، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۴

۳۔ ناصر عباس نیر، اُس کو اِک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں: میراجی کی نظم اور نثر کے مطالعات، (کراچی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۳۳

۴۔ فرانز فینن، افتادگانِ خاک، (کوئٹہ: گوشہ ادب جناح روڈ، سن ندارد)، ص ۱۷۱

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۷

۶۔ شمس الرحمن فاروقی، لفظ و معنی، مشمولہ: تنقید کی جمالیات از پروفیسر عتیق اللہ (لاہور: فکشن ہاؤس، جلد ۱۰، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۸۵

۷۔ اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو تنقید، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۶۴

۸۔ شہزاد احمد سوال یہ ہے، مرتبہ: نوشی انجم، (لاہور: بیکن بکس ۲۰۰۴ء)، ص ۲۸

۹۔ افتخار جالب، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء)، ص ۵۲

۱۰۔ سلیم احمد، نئی نظم اور پورا آدمی، (کراچی: نفیس اکیڈیمی، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۷

۱۱۔ وزیر آغا، نظمِ جدید کی کروٹیں، (لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۷

۱۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نظم کیسے پڑھیں، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۴۵

۱۳۔ سید عظیم، ملٹی نیشنل کمپنیاں، (لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۷

۱۴۔ شاہدہ حسن، نسائی شعور زندگی، مشمولہ خاموشی کی آواز، ترتیب: فاطمہ حسن، ڈاکٹر، آصف فرخی، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۷

۱۵۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۵۹

۱۶۔ ٹیری ایگلٹن، تھیوری کے بعد، مترجم: محمد دائود راحت، (سرگودھا: سرگودھا یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۴